مفتی صاحب کی کہانی میری زبانی

(۲)

سعید احمد اکبر آبادی

وقت گذرنے کے ساتھ بے تکلفی بڑھتی رہی اور ہم دونوں ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو گئے کہ میں مفتی صاحب کے خاندان کا ایک فرد ہو گیا اور مفتی صاحب میرے خاندان کے، چنانچہ ایک مرتبہ اماں جی (مفتی صاحب کی والدۂ محترمہ، جن کی وفات پر میں نے مہاجر میں ایک مضمون بھی لکھا تھا) نے مجھ سے فرمایا: میرے دو نہیں بلکہ تین بیٹے ہیں، عتیق، جلیل اور سعید۔ لیکن اس تمام بے تکلفی اور قربت کے باوجود مفتی صاحب اور میرے درمیان سن وسال اور مرتبۂ و مقام کا جو فاصلہ تھا اس کو میں نے ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ چنانچہ میں ان کو اپنا برادرِ بزرگ سمجھتا تھا اور وہ مجھ کو برادرِ خورد جانتے تھے، لیکن ایسا برادر جو دوست بھی ہو، کسی نے ایک عقلمند سے پوچھا: بھائی بہتر ہوتا ہے یا دوست؟ اس نے جواب دیا: وہ بھائی کس کام کا جو دوست نہ ہو اور میں دوست بھی تھا اور بھائی بھی، اس لئے یہ رشتہ بہت قوی تھا اور مضبوط بھی۔

میں ایک برس والدہ صاحبہ وغیرہا کے ساتھ محلہ ابوالمعالی میں رہا، پھر سب لوگ آگرہ چلے گئے تو میں بڑے بھائیوں کے محلہ میں ایک مکان میں رہنے لگا۔ اس کے

بعد میں نے مدرسہ کے اندر رہنے کا ارادہ کیا تو مدرسہ کے صدر دروازے کے اوپر جو ایک کمرہ بنا ہوا ہے اس میں حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدی، جن کا شمار اکابر اساتذہ دارالعلوم میں ہوتا تھا رہتے تھے۔ اس کمرہ کی بغل میں ایک کمرہ ہے، والد صاحب قبلہ کی خواہش کے مطابق مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نے میرے لئے یہ کمرہ تجویز کیا کہ میں ایک طرف خود ان کی اور دوسری جانب مولانا سراج احمد صاحب رشیدی کی براہ راست نگرانی میں رہوں، اس طرح بسلسلۂ طالب علمی میرے قیام دارالعلوم کے تین دور ہیں، دور اول میں میں گوشہ نشین رہا۔ گھر سے مدرسہ اور مدرسہ سے گھر، بس یہ میری دنیا تھی، طلبا سے خلا ملا بالکل نہیں تھا، البتہ جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں مفتی صاحب سے تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی، دور ثانی میں تعلقات کا حلقہ وسیع ہوا، میں نے طلبا کی انجمنوں کے جلسوں میں شرکت اور ان میں تقریر کرنا شروع کر دیا۔

اس سلسلہ میں ایک مرتبہ یہ دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحؒ کے ہاں ان کی بیٹھک میں روزانہ مغرب سے عشاء تک مجلس ہوتی تھی جس میں خالص علمی اور دینی گفتگو ہوتی تھی۔ وقتاً فوقتاً میں بھی اس مجلس میں شریک ہوتا تھا، ایک روز میں اور مفتی صاحب ہم دونوں اس مجلس میں حاضر ہوئے تو حضرت الاستاذ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: میاں سعید! تم تقریر کی مشق بھی کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! جمعیت محمدیہ کا جلسہ ہر جمعرات کو عشاء کے بعد ہوتا ہے، میں اس میں شریک ہو کر تقریر کرتا ہوں، مفتی صاحب کو بھانجی مارنے میں مزہ آتا تھا، فوراً بول پڑے: حضرت! یہ تقریر کیا کرتے ہیں، بس مولانا ابوالکلام آزاد کی کسی تقریر کے ایک جز کو رٹ لیتے ہیں اور جلسہ

میں اگرا ے اگل دیتے ہیں۔ حضرت الاستاذ نے یہ سنا تو بے ساختہ ہنس پڑے پھر فرمایا: شروع شروع میں یہ عادت بُری نہیں، اچھی ہے، کیونکہ اس طرح ایک نامور ادیب وخطیب کے خاص خاص جملے اور الفاظ زبان زد ہو جاتے ہیں اور مقرر اپنی تقریر میں انھیں الٹ پلٹ کرتا رہتا ہے اور اس طرح ایک دن وہ خود صاحب طرز اچھا مقرر بن جاتا ہے، لیکن یہ عادت مستقل ہرگز نہ ہونی چاہیئے، یہ بات تو ختم ہوگئی، لیکن اس کے بعد حضرت الاستاذ نے جو حکیمانہ بات کہی وہ بھی سننے کے لائق ہے، ارشاد ہوا: ہاں میاں! تقریر کی مشق ضرور کیا کرو، یہ سمجھو کہ انسان کا سر ایک صندوق ہے اور زبان اس کی کنجی ہے، اب فرض کرو تمھارے پاس ایک صندوق ہے جو ہیرے جواہرات سے پُر ہے لیکن اگر صندوق کی کنجی تمھارے پاس نہیں ہے تو پھر صندوق کس کام کا؟ اس سے نہ خود تم فائدہ اٹھا سکتے ہو اور نہ کوئی دوسرا، ہاں اگر کنجی تمھارے قبضے میں ہے تو اب صندوق تمھارے لئے بھی کارآمد ہوگا اور دوسروں کے لئے بھی۔

اس زمانہ میں مفتی صاحب کے گھر آنا جانا بھی زیادہ ہوگیا تھا اور اس طرح مفتی صاحب کے ذاتی فضائل وکمالات اور خاص عادات واطوار، جن کا ذکر تفصیل سے آگے آئے گا، ان کے مشاہدہ ومعائنہ کا موقع تو ملا ہی تھا، بڑی بات یہ ہوئی کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت بابرکت سے مستفید ومستفیض ہونے اور آپ کی نہایت سادہ اور بے تکلف مگر انتہائی عارفانہ زندگی کے احوال وشئون کے براہ راست اور قریبی مطالعہ کی سعادت نصیب ہونے لگی، حضرت مفتی صاحب کا روحانی مرتبہ ومقام کیا تھا؟ اس کا اندازہ تو میرا ایسا عامی آدمی کیا کرسکتا ہے، البتہ جو بات میں اپنے علم ویقین کی روشنی میں جزم اور قطعیت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ فقر ودرویشی جس کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے

سرمایۂ ناز فرمایا ہے، اس کا جو عالم میں نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ اقدس میں دیکھا ہے وہ عرب و عجم میں کہیں نظر نہیں آیا، وہ دارالعلوم دیوبند کے مفتیٔ اعظم اور شیخِ کامل تھے، ان کے شاگردوں اور مریدوں اور معتقدوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا، پھر مدرسہ میں چپراسی اور خدام بھی کم نہیں تھے، لیکن بالعموم صبح کے وقت مدرسہ جانے سے پہلے گھر کا سودا سلف لینے خود بازار جاتے تھے اور بازار جاتے وقت آس پاس کے گھروں کی عورتوں سے پوچھ لیتے تھے تاکہ انھیں کچھ منگانا ہو تو وہ بھی لیتے آئیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت و توجہات عالیہ سے میں نے کیا کچھ حاصل کیا ہے اس کا ذکر آئندہ جستہ جستہ آتا رہے گا۔ یہاں ایک دلچسپ وا سنئے، ایک مرتبہ حضرتِ موصوف مفتی صاحب کو اور مجھے ساتھ لے کر ایک بیل گاڑ کے ذریعہ دیوبند سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں پہنچے اور اپنے ا مرید یا معتقد کے گھر قیام فرمایا، یہ مغرب سے ذرا پہلے جھٹ پٹے کا وقت اور موسم کے آغاز کا زمانہ تھا، عشاء کے بعد کھانا آیا تو وہ باجرے کی روٹی اور چنے کے ساگ پر مشتمل تھا اور شاید کوئی چٹنی یا اچار بھی اس کے ساتھ تھا، یہ دیکھتے ہی مفتی صاحب کے ماتھے پر بل پڑ گیا، ان میں ایک کمال یہ تھا کہ کیسا ہی کوئی مجمع ہو وہ کسی ناگوار سے ناگوار احساس کو ظاہر کئے بغیر نہ رہتے تھے مگر ذرا مسکراتے ہو آنکھوں کی ایک خاص گردش اور معصومانہ لب و لہجہ کے ساتھ اس کا اظہار ا بلیغ انداز میں کرتے تھے کہ وہ ایک لطیف طنز ہوتا تھا اور سامعین برا ماننے بجائے اچانک ہنس پڑتے تھے، تو پھر بھلا اس موقع پر وہ چوکنے والے کہاں: بولے: ابا جی! کیا تزکیۂ نفس کی ایک شرط باجرے کی روٹی اور چنے کا سا کھانا بھی ہے؟ حضرت مفتی صاحب کو ہنسی آگئی اور نرم اور دھیمی آواز میں فر

[ہاں] عتیق ! کھا کے تو دیکھو کیا مزے کی چیز اور جاڑوں کا تحفہ ہے ، پھر حضرت [مجھ] سے مخاطب ہوئے اور پوچھا : تمہاری کیا رائے ہے ! میں نے عرض کیا : حضرت ! سبحان اللہ ، یہ گرم گرم روٹی اور اس پر خالص چپڑا ہوا اور یہ ساگ خالص گھی [میں] بگھرا ہوا ۔ اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے ، ہم شہر والوں کو یہ کہاں نصیب ! حضرت [مف]تی صاحب یہ سن کر خوش ہوئے اور فرمایا : اصل مقام شکر ایسی ہی چیزیں ہیں جن کو عرف عام میں ادنیٰ اور معمولی سمجھا جاتا ہے ، کیونکہ ان چیزوں پر شکر کرنے میں انسان کا اپنے متعلق اعتراف ہیچ میرزی بھی پایا جاتا ہے ۔

اس کے بعد حضرت نے ایک ایسی بات کہی کہ اسے سن کر کم از کم مجھے تو ایسا محسوس ہوا کہ گویا میرے دل پر ایک نشتر سا لگ گیا ، ارشاد ہوا : یوں تو میں امیروں اور دولت مندوں کے یہاں ان کے مکلف کھانے بھی کھاتا ہوں اور ان کو اللہ کی بڑی نعمت جان کر شکر ادا کرتا ہوں ، لیکن سچی بات یہ ہے کہ گھر کا سادہ کھانا کھانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب کے احساس سے قلب میں انشراح اور طمانیت کی جو کیفیت میں محسوس کرتا ہوں وہ مکلف کھانوں میں محسوس نہیں ہوتی ، مفتی صاحب پہ اس گفتگو کا کیا اثر ہوا ؟ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا ۔ البتہ میں نے یہ دیکھا کہ انھوں نے دیہاتوں میں جانا عموماً ترک کر دیا تھا اور اگر کبھی حضرت مفتی صاحب نے ساتھ چلنے کو کہا بھی تو انھوں نے کہہ دیا : جلیل (قاری جلیل الرحمٰن صاحب ، مفتی صاحب کے برادر خورد) کو ساتھ لے جائیے ، مجھ سے مٹی کے ڈھوبروں میں نہیں کھایا جاتا ۔

ہاں تو ذکر میرے قیام دار العلوم کے دور ثانی کا ہو رہا تھا جب کہ میں بڑے بھائیوں نامی محلہ کے ایک مکان میں رہتا تھا جسے مردانہ مکان ہونے کی وجہ سے بیٹھک کہتے تھے ، اس بیٹھک میں میرے ساتھ مفتی صاحب کے پھوپا ڈپٹی محمد اشفاق صاحب کے

فرزند محمود مفتی محمد کاکا بھی رہتے تھے جو دارالعلوم دیوبند میں پڑھتے تھے اور سبھی مجھ سے عزیز تھے، اس لیے کبھی کبھی ہفتہ عشرہ میں تین چار دن مجلس جما کرے یہاں اسی بیٹھک میں جمتی تھی جس میں چار پانچ احباب شریک ہوتے تھے جو سب دارالعلوم کی مختلف جماعتوں میں پڑھتے تھے، مجھ سے تعلق کی وجہ سے مفتی صاحب بھی ان مجلسوں میں شرکت کرتے تھے، ارکان مجلس سب ہی فارسی اور اردو شعر و ادب کا پاکیزہ اور شگفتہ ذوق رکھتے تھے اور خاص طور پر مفتی صاحب کا ذوق تو بہت ہی رچا بسا تھا اور وہ اگرچہ شعر تو نہیں کہتے تھے لیکن سخن فہم اعلیٰ درجہ کے تھے اور اس کی وجہ ایک تو خاندانی خصوصیت تھی اور پھر اکابر دیوبند کی اولاد کی طرح مفتی صاحب نے دارالعلوم کے درجۂ فارسی کے پنج سالہ نصاب کی تکمیل کی تھی اور ان کے استاد مولانا محمد لٰسین صاحب تھے جو اس زمانہ میں فارسی زبان و ادب کی مہارت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، اور ان کی تعلیم کا انداز ایسا تھا کہ طالب علم میں فارسی زبان و ادب کا پختہ ذوق پیدا ہو جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ایک بات یہ تھی کہ مفتی صاحب کے ایک چچا زاد بھائی جو ان کی پھوپی زاد بہن کے شوہر ہونے کے رشتہ سے بہنوئی بھی ہوئے جمیل الرحمٰن تھے، یہ انگریزی میں بی اے تھے اور سرکاری ملازم بھی تھے، مگر تھے نہایت ذہین اور طباع، اردو زبان کے بلند پایہ شاعر تھے، طبیعت میں غضب کی روانی تھی، نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت تھی، جمیل تخلص کرتے تھے اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے، تپ دق میں بیمار ہو کر جوانی میں چل بسے تھے[1]، مفتی صاحب اور مرحوم میں رشتہ داری کے علاوہ ہم مذاقی کے باعث

---

[1] عرصہ دراز ہوا ماہنامہ جامعہ، نئی دہلی میں، جب کہ اس کے اڈیٹر مولانا اسلم جیراجپوری تھے میں نے مرحوم پر ایک مضمون "اردو کا ایک جوان مرگ شاعر" کے عنوان سے لکھا تھا۔ میں نے مرحوم کو نہیں دیکھا تھا، مفتی صاحب سے جو کچھ سنا تھا مقالہ کی بنیاد وہی تھا۔

بہت گہرا اور بلند تعلق تھا۔ وہ اول درجے کے سخن سنج و سخن گو اور بہ اعلیٰ قسم کے سخن فہم سخن شناس۔ کوئی نئی غزل یا نظم جب تک مفتی صاحب کو سنا کر اس کی داد نہ لے لیتے انھیں چین نہ آتا تھا۔ پھر پڑھتے بھی بہت خوب تھے۔ مفتی صاحب کا بیان ہے جب وہ ترنم سے پڑھتے تھے ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ مفتی صاحب کو ان کی غزلوں کی غزلیں یاد تھیں۔

اب مفتی صاحب کے ذوقِ شعر و ادب کا یہ پس منظر ذہن میں مستحضر کر کے سنیے ہماری اور مجلس میں گفتگو کا موضوع عموماً شعر و ادب ہوتا تھا فارسی اور اردو دونوں کا کبھی عرفی اور نظیری پر تنقید ہوتی تھی اور کبھی غالب کے مشکل اشعار مثلاً:

"ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق" یا "تری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی"

وغیرہ وغیرہ، ان میں سے کوئی شعر لے لیا اور اس پر بحث شروع کر دی۔ مفتی صاحب ان گفتگوؤں میں بھی دلچسپی سے حصہ لیتے اور بڑے کام کی بات کہتے تھے جس سے ان کے مخصوص ادبی افکار و نظریات کا علم ہوتا تھا۔ مثلاً فارسی شاعری میں تغزل کے اعتبار سے عرفی اور نظیری کو امیر خسرو سے بڑا شاعر مانتے تھے، کہتے تھے، خسرو میں قدرتِ کلام اور جزالتِ فکر بے پناہ ہے، لیکن سوز و گداز اور احساسِ درد و غم جو تغزل کی جان ہے عرفی اور نظیری کے کلام میں خسرو سے زیادہ ہے، اسی طرح مفتی صاحب اردو شعراء میں غالب کی عظمتِ فکر و خیال اور اس کے تیکھے اندازِ بیان کے معترف تھے لیکن اس کے باوجود ان کے نزدیک تغزل میں مومن کا رتبہ غالب سے اونچا تھا اور اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے تھے کہ مومن میں جو سوز و گداز اور خود سپردگی ہے وہ غالب کے یہاں اس کی انانیت اور خود پرستی کی وجہ سے مفقود ہے، اس سلسلے میں ایک مرتبہ انھوں نے کہا کہ دیکھئے غالب کا ایک شعر ہے:

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں

اس شعر میں کس درجہ انانیت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے خود کہا ہے:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

اس کے بالمقابل اب مومن کا شعر دیکھئے۔ کہتے ہیں:

اس نقشِ پا کے سجدے نے کتنا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

ان دونوں شعروں میں کتنا بڑا فرق ہے ارباب ذوق اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔
ایک مرتبہ مفتی صاحب نے اپنے خاص درد بھرے لہجے میں مومن کی یہ غزل سنائی جس کے تین شعر مجھے اب تک یاد ہیں:

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں ۔۔۔ سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
بے نالہ منہ سے گرتے ہیں بے گریہ آنکھ سے ۔۔۔ اجزائے دل کا نہ حال تو پوچھ اضطراب میں
پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع ۔۔۔ مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

ان شعروں کو سنانے کے بعد مفتی صاحب نے بڑی قوت سے کہا کہ غالب کے پورے دیوان میں اس غزل کا کوئی جواب نہیں ہے۔ پھر ایک مرتبہ کہا کہ میں ہی نہیں بلکہ خود غالب بھی مومن کے قائل تھے اسی وجہ سے تو جب انھوں نے مومن کا یہ شعر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ۔۔۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

سنا تو غالب پھڑک اٹھے اور انھوں نے کہا کہ میں اس شعر کے بدلے میں اپنا پورا دیوان دینے کے لئے تیار ہوں غرضیکہ ہماری اس مجلس میں اسی قسم کے ادبی مذاکرے ہوتے تھے اور مفتی صاحب اپنے بلند ذوقِ شعر و ادب کے جوہر دکھاتے رہتے تھے جس سے ہم لوگوں کو بہت فائدہ ہوا۔